(۴۱)

ابتلاء مومن کی ترقی کا موجب ہوتے ہیں

(فرمودہ ۷۔ مارچ ۱۹۳۰ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ انسان کو متواتر جگاتا رہتا ہے کیونکہ انسان ان تعلقات کی وجہ سے جو اس کے جسم اور جسمانیات سے وابستہ ہیں غفلت کی طرف مائل رہتا ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا بیشتر حصہ ہمیں مجبوراً ایسے کاموں میں صرف کرنا پڑتا ہے جن کا براہِ راست دین سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک رنگ میں غفلت کا موجب ہوتے ہیں۔ نیند پر ہمارا بس نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے انسان کے لئے ضروری قرار دیا ہے اور ایسا ضروری قرار دیا ہے کہ ہم کُلّی طور پر اس سے مستغنی نہیں ہو سکتے تھوڑا بہت بہرحال ہر ایک کو سونا پڑتا ہے۔ اگر اس سونے کے وقت کو نکال دیا جائے تو ایک معقول حصہ زندگی کا کم ہو جاتا ہے۔ بچے عام طور پر آٹھ گھنٹے سوتے ہیں، نوجوانوں کو طبیب اور ڈاکٹر لوگ چھ سات گھنٹے سونے کا مشورہ دیتے ہیں غافل نوجوان عام طور پر نو دس گھنٹہ سوتے ہیں بلکہ بعض تو گیارہ بارہ گھنٹے بھی سوتے ہیں۔ دنیا میں ہوشیار لوگ کم ہیں اور غافل بہت زیادہ، اس لئے اگر اوسط لگائی جائے تو ہر انسان کیلئے نیند روزانہ سات آٹھ گھنٹے سے کم نہ ہوگی اور اس اوسط کے لحاظ سے انسان کی عمر کا تیسرا حصہ گویا نیند میں نکل جاتا ہے۔ اوسط عمر ہمارے ملک میں پینتیس چالیس سال ہے۔ یہ اگر چالیس سال بھی فرض کر لیں اور اس میں تیسرا حصہ نیند کا نکال دیا جائے تو باقی چھبیس سال رہتے ہیں اس میں سے اگر بچپن کا زمانہ نکال دیں اور بچپن کا زمانہ اگر پندرہ برس بھی فرض کر لیں تیسرا حصہ جو پہلے نکل چکا

ہے چونکہ اس میں بھی بچپن شامل ہے تو کم از کم دس سال اور کم کرنے پڑیں گے اور اس صورت میں صرف سولہ باقی رہ جائیں گے۔ پھر اگر بیماریوں وغیرہ کے دن نکال دیئے جائیں اور کم از کم ایک سال ہی ان کے لئے رکھا جائے تو باقی ۱۵ سال بچیں گے۔ ان میں سے اگر کھانے پینے، نہانے، کپڑے بدلنے، پاخانہ، پیشاب وغیرہ کے اوقات نکال دیں جو میرے نزدیک دو گھنٹہ روزانہ سے کم نہیں ہوتے تو اس حساب سے گویا بارہواں حصہ اور کم ہو گیا جو سَوا سال ہوتا ہے اور اس طرح پونے چودہ سال رہ جاتے ہیں یہ وہ وقت ہے جو جاگنے کا ہے۔ اس میں ہی دنیوی ضرورتیں پورا کرنے کا وقت بھی ہے دوستوں کی ملاقات کا وقت بھی، سفر کا بھی، زمیندار کو اپنا زمینداری کا کام کرنا ہوتا ہے اور نوکر کو نوکری کا اور اگر یہ کام روزانہ چھ گھنٹے بھی فرض کر لیں تو ۱/۴ حصہ اور نکل جاتا ہے۔ بچپن کا پندرہ برس کا زمانہ نکال کر باقی ۲۵ سال کا ۱/۴ حصہ سَوا چھ سال ہے۔ اس میں سے گھر کے کام کاج سودا سلف کی خرید و فروخت، بچوں کی نگرانی، بیوی بچوں سے ملنا جلنا، ان کے حقوق ادا کرنا وغیرہ کاموں کے اوقات نکال دیں تو سَوا چھ سال میں سے بھی قریباً نصف عرصہ باقی رہ جاتا ہے اور اس طرح گویا قریباً چار سال کا عرصہ ہے جسے انسان خدا تعالیٰ کی عبادت میں خرچ کر سکتا ہے۔ کرتا ہے کا سوال نہیں بلکہ یہ وہ عرصہ ہے جو اگر انسان چاہے تو خرچ کر سکتا ہے لیکن اگر دیکھا جائے کہ واقعی کتنا خرچ کرتا ہے تو اس کی مقدار بہت قلیل نظر آئے گی۔ جو لوگ نماز وغیرہ کے پابند اور دین کی طرف رغبت رکھنے والے ہوتے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ روزانہ دینی کام میں صرف کرتے ہیں یعنی اٹھارہواں حصہ۔ اور اگر بچپن کی عمر کو نکال دیا جائے تو بقیہ عمر کے لحاظ سے اس عرصہ کے دوسَوا دو سال بنتے ہیں گویا دنیا کے نیک لوگ اپنی عمر کا بیسواں حصہ خدا تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں اور باقی اُنیس حصے اپنی جسمانی ضروریات، روزگار، سیر و سیاحت اور بیوی بچوں کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ سو جہاں ۱/۱۹ حصہ غفلت اور صرف ایک حصہ ہوشیاری کا سامان ہو اور وہ بھی صرف نیک لوگوں کے لئے، غافل لوگوں کی بیداری کا زمانہ تو ایک دو یوم یا ہفتہ دو ہفتہ سے زیادہ نہیں نکلے گا۔ ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے گذرتے جائیں گے اور انہیں خدا تعالیٰ کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوگی۔ وہ گذرتے ہوئے کسی لُولے لنگڑے یا اپاہج کو دیکھتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں خدا کی قدرت لیکن اگلے ہی قدم پر خدا تعالیٰ کی قدرت انہیں بھول جاتی ہے۔ ان کے گھر میں بیماری ہو تو کہتے ہیں خدایا رحم کر۔ لیکن

تھوڑا ہی عرصہ بعد وہ خدا تعالیٰ کے رحم کو قطعاً فراموش کر دیتے ہیں۔ پس جہاں اس قدر غفلت کے سامان ہوں وہاں ضروری ہے کہ جگانے کے سامان بھی ہوں یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ انسان کو بار بار جگاتا رہتا ہے۔ کہیں مالی ابتلاء، کہیں عزت و آبرو کے ابتلاء، کہیں عزیز و اقارب کی جدائی کے ابتلاء لاتا ہے۔ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ[1]

یعنی دنیا کی چیزیں انسان کو ہر لحظہ اپنی طرف کھینچ رہی ہیں اور وہ ہماری طرف متوجہ نہیں ہوتے اس لئے ہم انہیں چھیڑتے رہتے ہیں تا وہ اس خیال سے کہ کہیں عذاب اکبر میں مبتلاء نہ ہو جائیں وہ ہماری طرف آ جائیں اور زندگی کا اصل مقصد حاصل کر لیں۔ غرض ابتلاء درحقیقت انسان کے ایمان کی پختگی کا موجب ہوتے ہیں لیکن یہی ابتلاء بعض کو خدا تعالیٰ سے اور بھی دُور پھینک دیتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ایک دوست کے متعلق جو بعد میں سلسلہ میں بھی داخل ہو گئے اور مخلص تھے فرمایا کرتے میں نے اِس وجہ سے ان کے ساتھ لمبے عرصہ تک بولنا چھوڑ دیا کہ ان کا ایک لڑکا فوت ہو گیا جب جنازہ پر میرے بڑے بھائی صاحب گئے تو وہ دَوڑ کر ان سے چمٹ گئے اور چلّا کر کہنے لگے مجھ پر خدا تعالیٰ نے بڑا ظلم کیا ہے۔ اسی طرح ایک عورت کے متعلق جس کا لڑکا فوت ہو گیا تھا سنا کہہ رہی تھی خدایا! اگر تیرا لڑکا فوت ہوتا تو تجھے معلوم ہوتا کہ کتنی تکلیف ہوتی ہے، یہ اس کی جہالت اور نادانی تھی۔ خدا نے ہی اسے لڑکا دیا تھا اسی نے لے لیا اس کا اس میں کیا تھا مگر اس نے یہ نہ سمجھا اور بیہودہ گوئی کرنے لگی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ بیٹے بیٹیوں سے پاک ہے لیکن پھر بھی جو اُس کے سب سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں وہ ان کو سب سے زیادہ ابتلاء میں ڈالتا ہے تا دنیا یہ نہ کہے کہ اپنے پیاروں کو چھوڑ دیتا ہے۔ وہ اولاد سے بے شک پاک ہے مگر وہ اپنے پیاروں سے اس قدر محبت کرتا ہے کہ کوئی ماں اپنے بچہ سے نہیں کر سکتی مگر پھر بھی اس نے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور سب سے آخر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے مصائب میں دیکھا کہ دنیا کا کوئی ماں باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو تو درکنار اپنے دس بیٹوں میں سے کسی ایک کو بھی ایسی تکالیف میں نہیں دیکھ سکتا مگر پھر بھی اُس نے انہیں اِس حالت میں رہنے دیا اور کہا ابھی ان کو اور پکنے دو۔ اس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلنے کی تکلیف میں دیکھا مگر یہی کہا کہ اسے بھٹی میں پڑ کر صاف ہونے

دو۔ اس نے سالہا سال تک حضرت نوحؑ کو دشمنوں کے ہاتھوں اس طرح ذلّت سے مسلا جاتا اور پامال ہوتا دیکھا جس طرح ذلیل سے ذلیل کیڑے کو بھی کوئی نہیں مسلتا مگر خاموش رہا اور کہا اس کو ان مصائب سے گذرنے دو کہ یہ میرا قُرب اور کمال حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا مگر اللہ تعالیٰ جو ان سے بہت محبت کرتا تھا خاموش رہا۔ پھر حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور بالآخر رسول کریم ﷺ کو بھی تکالیف پیش آئیں۔ آپؐ پر ایسے ایسے مصائب آئے کہ آج کوئی انسان انہیں پڑھ کر اپنے آنسو نہیں روک سکتا لیکن باوجود اس کے کہ آپ سید ولدِ آدم تھے۔ خاتم النّبیّن تھے، تمام نبیوں کے سردار تھے اور باوجود اس کے کہ آپ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پیارے تھے کہ اس نے اپنی محبت کو آپ میں مرکوز کر دیا اور فرما دیا اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [۲] اور اپنی محبت کے تمام دروازے بند کر دیئے سوائے اس کے جو محمد ﷺ میں سے ہو کر آتا تھا مگر آپ کو مصیبت پر مصیبت آئی۔ فاقہ پر فاقے ہوئے، آپ نے اپنے محبوبوں اور عزیزوں کو بھوک پیاس سے اپنے سامنے تڑپتے دیکھا۔ تین سال تک محصور رہے، جہاں کھانے کے لئے کچھ نہیں ملتا اور درختوں کے پتے کھا کر گذارہ کرتے تھے۔ ایک صحابی کہتے ہیں ہمیں آٹھ آٹھ دن پاخانہ نہیں آتا تھا اور جب آتا تھا تو بکری کی مینگنیوں کی طرح کا آتا کیونکہ کھانے کو کچھ نہیں ملتا تھا اور ہم درختوں کے پتے کھاتے تھے۔ [۳] یہ حالت تین سال تک رہی۔ پھر اس کے معاً بعد عزیز ترین وجود آپ سے جُدا ہو گیا یعنی آپ کی محبوب اور غمگسار بیوی فوت ہو گئیں۔ پھر اور تکالیف آئیں اور اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو لمبا کرتا گیا کیونکہ وہ دنیا کو دکھانا چاہتا تھا کہ اس کا سب سے زیادہ محبوب اس کیلئے سب سے زیادہ تکالیف برداشت کر رہا ہے۔

غرض خدا تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو جگانے کے لئے مصائب نازل کرتا رہتا ہے۔ مؤمنوں کے لئے ان مصائب کا نام اس نے ابتلاء رکھ دیا ہے اور منکروں کے لئے عذاب۔ مؤمنوں کے لئے صرف عزت کے لئے اور نام رکھ دیا تا ان کے احترام میں فرق نہ آئے اور تا دنیا یہ نہ کہے کہ خدا اور اس کے رسولوں کو ماننے والے بھی عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں ورنہ چیز ایک ہی ہے۔ جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کھانا ٹھونس لو۔ کسی سے کہتے ہیں کھانا کھا لیجئے اور کسی سے کہتے ہیں تناول فرما لیجئے بات تو ایک ہی ہے لیکن ٹھونس لو کہنا ناراضگی کیلئے، کھا لیجئے برابری کیلئے اور تناول فرما لیجئے اعزاز کے لئے ہے ورنہ بات ایک ہے۔ اسی طرح مؤمن اور کافر دونوں کو

مصائب اور مشکلات کا سامنا ہوتا ہے مگر نام دونوں کے لئے الگ الگ رکھ دیئے گئے۔ کافر کی تکالیف کا نام عذاب اور مؤمن کی تکالیف کا ابتلاء رکھ دیا گیا۔ پھر مقصد بھی ایک ہی ہے خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ غافل لوگ بیدار ہوں اور جو بیدار ہو چکے ہیں وہ اور ترقی کریں۔ مگر بعض ان عذابوں اور ابتلاؤں سے ترقی کرنے کی بجائے ٹھوکر کھاتے اور اپنی اپنی حالت کے مطابق اور پیچھے جا پڑتے ہیں۔ مؤمن تو فائدہ اٹھاتا ہے لیکن جس کے ایمان میں خلل ہو وہ ٹھوکر کھا جاتا ہے۔

مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں ایک روایت لکھی ہے بلحاظ روایت تو اس کی صحت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن سبق حاصل کرنے کے لئے بہت مفید ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت لقمان کو بچپن میں کوئی شخص اٹھا کر لے گیا اور کسی تاجر کے پاس فروخت کر دیا آپ اس تاجر کے پاس رہنے لگے۔ آپ کی لیاقت اور ذہانت کو دیکھ کر وہ تاجر آپ سے بے حد محبت کرتا اور آپ کو اپنے بچوں کی طرح رکھتا حتّٰی کہ آپ کے بغیر کوئی چیز نہ کھاتا اور جب کچھ کھانے لگتا تو ان کو بھی شریک کر لیتا۔ ایک دفعہ اس کے ایک گماشتہ نے کسی دُور دراز علاقہ سے اس کے لئے بے موسم کا خربوزہ بھیجا۔ تاجر نے اس کی ایک قاش کاٹ کر حضرت لقمان کو دی آپ نے اسے نہایت مزے سے کھایا۔ تاجر سمجھا بہت مزیدار ہے اس لئے اس نے ایک اور قاش دی وہ بھی انہوں نے اسی طرح مزے سے کھائی۔ اس پر اس کی طبیعت بھی چاہی کہ ایسا مزیدار خربوزہ خود بھی کھائے اور ایک قاش کاٹ کر اس نے اپنے منہ میں ڈالی مگر اسے معلوم ہوا کہ خربوزہ سخت کڑوا ہے اس پر وہ حضرت لقمان سے ناراض ہوا کہ میں تو تمہارے مزے کی خاطر تمہیں دے رہا تھا اگر کڑوا تھا تو تم نے مجھے بتا کیوں نہ دیا یا اپنے چہرہ سے اس کی کڑواہٹ کا اظہار کیوں نہ کیا۔ حضرت لقمان نے جواب دیا جس ہاتھ سے میں اتنی میٹھی چیزیں کھا چکا ہوں اس سے ایک کڑوی ملنے پر میں اس قدر احسان فرموش کیوں بنتا کہ منہ بنانے لگتا۔

مؤمن کا کام ہے کہ اگر خدا تعالیٰ کی طرف سے اسے زجر ہو تو بھی اپنے ایمان کو متزلزل نہ ہونے دے کیونکہ قرآن شریف میں منافق کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ جب تک اسے ہم نعمتیں دیتے جائیں وہ خوش رہتا ہے لیکن جب ہاتھ روک لیں ناراض ہو جاتا ہے۔[۴] مگر مؤمن ابتلاء میں ثابت قدم رہتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ایک عبرت انگیز واقعہ ہے آپؐ جنگ تبوک کیلئے نکلے بعض لوگ پیچھے رہ گئے۔ آپ ان پر ناراض ہوئے اور حکم دیا ان سے کوئی

کلام نہ کرے اور کچھ دنوں کے بعد حکم دیا ان کی بیویاں بھی ان سے علیحدہ رہیں۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی سرزنش تھی۔ ایک صحابی[۵] بیان کرتے ہیں میں متواتر رسول کریم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتا اور آ کر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتا اور خیال کرتا آپ بولیں گے تو نہیں مگر شاید منہ میں جواب دیں اس لئے میں آپ کے ہونٹوں کی طرف دیکھتا لیکن جب کوئی حرکت نہ ہوتی تو اُٹھ کر چلا جاتا اور دوبارہ آ کر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتا اور پھر ہونٹوں کی طرف دیکھتا جب ہونٹوں میں حرکت نہ نظر آتی تو پھر باہر چلا جاتا اور پھر آتا اسی طرح آتا جاتا رہتا۔ ایک دفعہ میں اپنے بھائی کے ساتھ ہولیا جس سے مجھے اتنی محبت تھی کہ ہمیشہ ہم اکٹھا کھانا کھاتے تھے اس سے میں باتیں کرتا گیا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے تنگ آ کر کہا کہ تُو تو اچھی طرح جانتا ہے میں منافق نہیں ہوں محض غفلت کی وجہ سے پیچھے رہ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف سر اُٹھا کر کہا اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتا ہے۔ اس پر میں نے خیال کیا اِس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اتنا عزیز بھائی بھی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔ میں دل برداشتہ ہوکر بازار کی طرف چلا گیا راستے میں مجھے بعض لوگوں نے بتایا کہ ایک اجنبی تمہیں پوچھتا پھرتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص نے پوچھا کیا تم کعب بن مالک ہو؟ وہ شخص غسّان کے فرمانروا کا ایلچی تھا جو سرحد پر سلطنت روما کے ماتحت ایک عیسائی ریاست تھی۔ اس نے مجھے ایک خط دیا جس میں لکھا تھا ہمیں معلوم ہے تم کتنے معزز آدمی ہو اور قوم میں تمہیں کس قدر رسوخ اور تصرف حاصل ہے مگر خبر ملی ہے کہ محمد نے تم سے ایسا بُرا سلوک کیا ہے جو ذلیل لوگوں سے بھی نہیں کیا جاتا اس کا ہمیں بہت افسوس ہے اگر تم ہمارے پاس آ جاؤ تو ہم تمہارا مناسب اعزاز کریں گے۔ میں نے یہ خط پڑھ کر دل میں کہا یہ شیطان کا آخری حملہ ہے۔ خط لانے والے سے میں نے کہا آؤ اس کا جواب دوں۔ میں اسے ساتھ لے کر چلا آگے ایک تنور جل رہا تھا میں نے خط اس میں پھینک کر کہا اپنے آقا سے جا کر کہہ دو کہ اس کے خط کا یہ جواب ہے۔ یہ کہہ کر میں گھر آ گیا چونکہ کوئی بات تو کرتا نہیں تھا اس لئے میں اب گھر میں ہی رہنے لگا۔ آخر ایک دن صبح کی نماز کا وقت تھا کہ میں نے سنا ایک شخص دُور پہاڑی سے آواز دے رہا ہے۔ کعب بن مالک! مبارک ہو خدا اور اس کے رسولؐ نے تمہیں معاف کر دیا۔ کعب بن مالک مالدار آدمی تھے اور جنگ سے بھی وہ اسی لئے رہ گئے تھے کہ انہوں نے سمجھا میرے پاس سواری ہے جب چلوں گا لشکر میں جا کر شامل ہو جاؤں گا مگر وہ اسی خیال میں رہ گئے۔ انہوں نے کہا میں چونکہ مال و دولت کی وجہ سے جہاد سے محروم رہا ہوں اس لئے اپنی ساری جائداد

خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہوں اور ایسی وفاداری سے اس عہد کو نبھایا کہ جس شخص نے سب سے پہلے آپ کو مبارک باد دی اسے بھی اپنے ایک دوست سے قرض لے کر تحفہ دیا۔ اپنے مال سے کچھ نہ دیا۔[6] کیونکہ وہ ان کے نزدیک ان کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہو چکا تھا تو مؤمن ابتلاء میں ترقی کرتا ہے لیکن منافق اور بھی گر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ابتلاء آتے ہیں وہ اس لئے آتے ہیں کہ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔[7] جب کافر پر عذاب بھیجنے سے بھی خدا تعالیٰ کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کی طرف لوٹے تو مؤمن پر ابتلاء اسے اپنے سے دُور کرنے کے لئے کس طرح ہو سکتا ہے۔ جو شخص دشمن کو بھی اس کے فائدہ کے لئے سزا دیتا ہے وہ دوست کو نقصان کے لئے کس طرح تکلیف دے سکتا ہے لیکن بعض نادان اپنے نفع و نقصان اور مفید و مُضِرّ میں امتیاز نہ کر سکنے کی وجہ سے سخت ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب پہنچتا ہے اس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ دلوں کو صاف کرے۔ اگر انسان اس سے سبق حاصل کرے تو وہی اس کے لئے برکت کا موجب ہو جاتا ہے اور اگر دُور جا پڑے تو اللہ غنی ہے اسے کسی کی پرواہ نہیں۔ اس لئے تم پر بھی جب کوئی مصیبت آئے تو اگر اپنے آپ کو منافق سمجھتے ہو جب بھی یہی خیال کرو کہ اس کی غرض لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ہے اور اگر اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا دوست سمجھتے ہو تو یہ خیال کرو کہ جب کوئی ذلیل انسان بھی اپنے دوست کو نقصان نہیں پہنچاتا تو خدا تعالیٰ اپنے دوست کو کس طرح ضائع کر سکتا ہے پس یقین رکھو کہ وہ ابتلاء بھی تمہارے اعزاز کے لئے ہے تباہی کے لئے نہیں۔

(الفضل ۱۸۔ مارچ ۱۹۳۰ء)

---

[1] السجدة: ۲۲ [2] اٰل عمران: ۳۲

[3] بخاری کتاب المناقب باب مناقب سعد بن ابی وقاص

[4] بنی اسرائیل: ۸۴

[5،6] حضرت کعب بن مالک، بخاری کتاب المغازی باب حدیث کعب بن مالک

[7] الروم: ۴۲